وزیر خانم اور امراؤ جان ادا: تقابلی مطالعہ

ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان☆

Abstract

This paper presents a comparative study of two important characters of Urdu's two significant novels. They are Amra-o-Jan e Ada by Mirza Hadi Ruswa and 'Kai Chand Thy Zer e Asman by Shams al-Rehman Faruqi. Both these characters are representatives of beauty and lust and both are about tyranny and exploitation meted out to women. The article is a comparative study of differences, commonalities and contradictions found in both characters.

اکتوبر ۱۹۴۵ء میں حیدر آباد میں ترقی پسند مصنفین کی کل ہند اردو کانفرنس منعقد ہوئی جس میں فحاشی کے مسئلے پر ایک قرارداد پیش ہوئی جس کے الفاظ کچھ اس طرح کے تھے "کانفرنس ایک بار پھر اس بات کو واضح کر دینا چاہتی ہے کہ ترقی پسند ادیب، ادب میں فحش نگاری کے خلاف ہیں......" اس موقع پر مولانا حسرت موہانی نے یہ تجویز پیش کی کہ اس میں ایک جملے کا اضافہ کر دیا جائے: "لیکن وہ لطیف ہوس ناکی کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔" مولانا کی اس ترمیم پر خاصی بحث وتکرار ہوئی۔(۱)

سر دست ہمیں 'تحریک' سے نہیں 'ترکیب' سے غرض ہے جو حسرت موہانی نے وضع کی تھی، یعنی ___ لطیف ہوس ناکی! لفظِ لطیف سے نہ صرف ہوس ناکی کی شدت میں کمی واقع ہوئی ہے بل کہ تخلیقی اور معنوی لطافت میں اضافہ بھی ہوا ہے اور ___ تھا جو نا خوب، بتدریج وہی خوب ہوا! اس

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لوئر مال کیمپس، لاہور

ترکیب کا اطلاق شمس الرحمٰن فاروقی کے ناول کئی چاند تھے سرِ آسماں پر بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض مقامات پر یہ لطافت، بے کثافت، جلوہ پیدا نہیں کر سکی لیکن زیادہ تر یہ 'ہوس ناکی' حسن پرستی کی ذیل میں آئی ہے۔ فاروقی صاحب نے حسنِ زن کو جہاں کہیں ظاہر کی آنکھ سے دیکھا ہے، وہاں لذت انگیزی پیدا ہوئی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے ذوقِ مشاہدہ، قوتِ تخیل اور زورِ قلم کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے متعلقاتِ حسن کو تفصیل سے بیان کیا ہے بل کہ بعض غیر متعلقہ تفصیلات بھی رقم کی ہیں۔ لیکن دراصل یہی تفصیلات، اس ناول کی جان ہیں۔ بقول فراق: یہ ادائے حیا جان ہے محبت کی۔ ناول میں اگر چہ 'حیا' اور 'حجاب' کے برعکس صورتِ حال ہے۔

''وزیر خانم'' ناول کا مرکزی کردار ہے اور ناول نگار نے اس 'مرکز' کو ہر زاویے سے دیکھا ہے۔ وزیر خانم کا حسن و جمال، ناول نگار کے حسنِ تخیل کا مرہونِ منت ہے۔ فاروقی صاحب جب وزیر خانم کے پیکر کے خطوط کھینچتے ہیں تو ناول نگار نہیں رہتے، سراپا نگار بن جاتے ہیں۔ ایک خوش نظر اور نادر الکلام شاعر کی مانند!! سراپا نگاری کرتے ہوئے وہ جب کبھی از خود رفتہ ہوتے ہیں تو امراؤ جان ادا کی یاد آتی ہے جس نے اپنے ایک آشنا کے بارے میں کہا تھا: ''ان کے مذاق میں فحش حدِ اعتدال سے زیادہ ہے۔''(۲) بہر طور فاروقی صاحب کی 'بے اعتدالی' کی ایک خاص منطق اور جواز ہے۔ وہ جب کبھی سراپا نگاری یا معاملہ بندی کرتے ہیں تو دراصل ایک خاص عہد کے تہذیبی زوال کا نوحہ رقم کر رہے ہوتے ہیں۔ نسوانی حسن کے پردے میں وہ تہذیب کی بدصورتیوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ حسن و جمال کا بیان دراصل اخلاقی زوال کا بیان ہے۔ یہ ناول درحقیقت اس عہد کی عورت کا المیہ بھی ہے جسے وزیر خانم کے کردار کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ ناول کا نام بھی اگر ''وزیر خانم'' ہوتا تو زیادہ مناسب تھا جیسے مرزا ہادی رسوا نے اپنے ناول کا عنوان مرکزی کردار ''امراؤ جان ادا'' کے نام کی رعایت سے تجویز کیا تھا۔(۳) دونوں عورتوں کی کہانی اگر چہ مختلف ہے لیکن المیہ ایک ہے۔ عورت کا صنفی اور جنسی استحصال!

امراؤ جان ادا، حالات کے جبر اور قدرت کی ستم شعاری کے باعث ایک پیشہ ور طوائف بن جاتی ہے۔ رسوا نے اس کی کہانی کو اسی کی زبانی پیش کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ 'کسر نفسی' کا مظاہرہ

کرتے ہوئے ذاتی حسن و جمال کی تصویر کشی نہیں کرتی۔ امراؤجان' نے 'ازراہِ انکسار' اپنے حسن سے تغافل برتا ہے اور کچھ اس طرح کے جملے ادا کرکے پہلو تہی کر جاتی ہے:

''خانم کی نوچیوں میں یوں تو میرے سوا ہر ایک اچھی تھی......'' (۴)

''میری صورت بہ نسبت اوروں کے کچھ اچھی نہ تھی......'' (۵)

آغازِ جوانی میں امراؤجان نے اپنے جمال کو کچھ دیر کے لیے ستائش کی نظر اور آرائش کے خیال سے دیکھا تھا لیکن پھر فوری طور پر صرفِ نظر کا انداز اختیار کر لیا:

> ''اول اول تو مجھے آئینہ دیکھنے کا شوق ہوا۔ اب میرا سن چودہ برس کا تھا۔ ادھر بوا حسینی کوٹھری سے ٹلیں اُدھر میں نے ان کی پٹاری سے آئینہ نکالا، اپنی صورت دیکھنے لگی۔ اپنا ناک نقشہ اور رنڈیوں سے ملاتی تھی۔ مجھے اپنے چہرے بھر میں کوئی چیز بری نہ معلوم ہوتی تھی، بلکہ اوروں سے اپنے کو بہتر سمجھتی تھی، اگر چہ درحقیقت ایسا نہ تھا۔'' (٦)

ایک مقام پر امراؤجان ادا کے حسن کا نقشہ بالواسطہ طور پر کھینچا گیا ہے۔ ناول کے ایک نسوانی کردار بیگم صاحب کے جمال کی تصویر کشی کرتے ہوئے امراؤجان کی ایک جھلک بھی دکھائی گئی ہے لیکن یہ جھلک 'اک حسن تھا کہ محوِ تماشائے حسن تھا' قسم کی ہے:

''پہلے تو وہ باغ اور وہاں کی فضا دیکھ کے مجھے پرستان کا شبہ ہوا تھا مگر اب یقین ہو گیا۔ پری میرے سامنے گاؤ تکیے سے لگی بیٹھی ہے۔ مانگ نکلی ہوئی ہے۔ چوٹی کمر تک پڑی ہوئی، سرخ و سفید رنگت، اونچا ماتھا، کھنچی ہوئی بھویں، بڑی بڑی آنکھیں، گال جیسے گلاب کی پتیاں، ستواں ناک، چھوٹا سا دہانا، پتلے پتلے نازک ہونٹ۔ نقشے بھر میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے بہتر میرے خیال میں کوئی چیز آ سکتی ہو۔ اس پر اعضا کا تناسب اور سینے کا ابھار پن کس قدر خوش نما تھا۔ سیکڑوں عورتیں میری نظر سے گزر گئیں مگر میں نے اس بلا کی صورت کبھی نہ دیکھی تھی......بیگم صاحب بہت خوش مزاج معلوم ہوتی ہیں۔ بات کرتی ہیں تو گویا منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ ہر بات پر خود بخود ہنسے دیتی ہیں مگر کسی کو مجالِ

کلام نہیں۔ واقعی سادگی میں تکلف اور تمکنت کے ساتھ شوخی انھی میں دیکھی۔ دولت مندوں کی خوشامد سب کرتے ہیں مگر عورت ذات ہو کے کہتی ہوں کہ ایسوں کی خوشامد بھی اگر بے غرض کی جائے تو کچھ عیب نہیں۔ لباس اور زیور بھی اسی صورت کے لائق تھا۔ مہین بسنتی دوپٹا کندھوں سے ڈھلکا ہوا، کیچلی کا شلوکا پھنسا پھنسا، سرخ گرنٹ کا پائجامہ، کانوں میں صرف یاقوت کے آویزے، ناک میں ہیرے کی کیل، گلے میں سونے کا سادہ طوق، ہاتھوں میں موتیوں کی سمرنیں، بازوؤں پر نورتن، پاؤں میں سونے کی بیڑیاں۔ چہرے کی خوبصورتی، لباس کی سادگی اور زیور کی مناسبت، یہ سب چیزیں میری آنکھوں کے سامنے تھیں اور میں نقش حیرت بنی بیٹھی تھی۔ بغور صورت دیکھ رہی تھی۔ میں اور میری صورت تو جیسی کچھ ہے، وہ اس وقت آپ کے سامنے ہے، مگر یقین ہی کیجیے گا، ان کی توجہ بھی کسی اور طرف نہ تھی، مجھ کو دیکھ رہی تھیں۔ دونوں طرف سے نگاہیں لڑی ہوئی تھیں۔''(۷)

امراؤ جان ادا کی صورت سے قاری آشنا نہیں ہونے پاتا اور اگر اردو ناول کے نسوانی کرداروں کی بھیڑ میں وہ کھو جائے تو 'تلاشِ گم شدہ' کے اشتہار کے لیے اس کے ظاہری کوائف دست یاب نہیں ہوں گے۔ اس کے مقابلے میں وزیر خانم مقابلۂ حسن کی ایسی فتح یاب امیدوار معلوم ہوتی ہے جس کے لب و رخسار اور بدن کے اسرار سے زمانہ آشنا ہے۔ یہ حکایتِ حسن اگر چہ خاصی لذیذ ہے لیکن اس کے باوجود درازی کا خوف طاری ہے، اس لیے وزیر خانم کے جمال کی صرف ایک تصویر پیش کی جا رہی ہے:

''کسی انتہائی خوبصورت لڑکی کی تصویر تھی۔ اس کی عمر یہی چوبیس چھبیس سال کی رہی ہوگی۔ سانولا رنگ، لیکن اس قدر ترو تازہ چہرہ گویا کسی نے سوسن کے پھول کا جوہر نچوڑ کر رکھ دیا ہو۔ سیدھی، نازک سی ناک، لیکن دونوں نتھنے ذرا پھڑکتے ہوئے سے، جیسے اس نے کوئی اچھی بات سنی ہو یا کوئی اچھی بات کہنے والی ہو۔ کوئی ڈیڑھ دوسو برس پرانی تصویر دوچشمی تھی لیکن اس زمانے کی عام تصویروں سے برخلاف صاحبِ تصویر کو یوں دکھایا گیا تھا گویا وہ مصور، اور تماشائی، دونوں کے وجود کا پورا احساس رکھتی ہو۔ اس کی آنکھوں میں جنس اور شباب کا ایسا بھرپور شعور تھا کہ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

لگتا تھا یہ تصویر اپنی آنکھ یا ابروسے مجھے کوئی اشارہ کرنے والی ہے لیکن اس اشارے میں کوئی رکاکت یا سوقیانہ پن نہ تھا، بلکہ ایک طرح کی چنوتی تھی، کہ کیا تم اس فتنہ سامانی سے عہدہ برآ ہونے کا دل رکھتے ہو؟ سڈول چہرے پر بڑی بڑی آنکھیں، ان پر لمبی لمبی پلکیں، لیکن سایہ فگن نہیں، چلمن کی طرح کچھ اٹھی ہوئی۔ آنکھوں کا رنگ شربتی، گہرا اور ہلکی سی سنہری دمک لئے ہوئے اور سفیدی ایسی سفید اور اس میں ہلکی سی ٹھنڈک کی ایسی کیفیت جیسے تازہ کھلا ہوا گل مشکی۔ آہو کی سی لمبی سڈول گردن میں مالا ے زمرد، نولڑوں کا، لیکن سب دانے برابر کے اور ہم رنگ وہم شکل تھے۔ گلے کے نیچے تک وادی شانہ میں چنے کی دال کے برابر زمردی زمرد تھے جن کی سبزی آنکھوں میں ہری دوب کی طرح کھبی جاتی تھی۔ آنچل سر پر نہ تھا، اور صاف معلوم ہو رہا تھا کہ صاحب تصویر کو آنچل کے ڈھلک جانے کا علم ہے۔ سنہرے بادلے سے پٹا ہوا آسمانی دوپٹہ شانے اور سینے کو بے پروائی سے کچھ ڈھک رہا تھا کچھ نمایاں کر رہا تھا۔ بہت گھنی چوٹی تھوڑی سی کھلتی ہوئی، ہر لٹ میں ایک دو موتی ٹکے ہوئے، گویا بے خیالی میں وہاں الجھ گئے ہوں۔''(۸)

امراؤ جان ادا نے لکھنؤ میں باقاعدہ ایک طوائف کے کوٹھے پر پرورش پائی تھی اس لیے اس کی شخصیت میں نفاست، تہذیب، خوش ذوقی اور وضع داری کا نمونہ ہے۔ وزیر خانم باقاعدہ طور پر کسی کوٹھے کی تربیت یافتہ نہ تھی لیکن یہ اوصاف اس کی شخصیت میں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اس نے یہ 'فیضان' اپنی نانی سے دہلی میں حاصل کیا تھا جو فرخ آباد کی مشہور ڈیرے دارنی تھی۔ وزیر خانم کا زیادہ وقت نانی کے ''عشرت کدے'' پر گزرتا اور وہیں بچپن میں اس نے موسیقی کی تعلیم حاصل کی۔ وزیر کے والد محمد یوسف سادہ کار نے اپنی دختر کے ذوقِ موسیقی کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

''گلا اس کا شروع ہی سے اچھا تھا اور اگرچہ موسیقی جیسی مشکل چیز کا ریاض اس کے مزاج کے موافق نہ تھا لیکن نانی کے ہاں اٹھتے بیٹھتے اسے بعض معمولی راگ راگنیاں بھی بخوبی یاد ہوگئی تھیں۔ یمن، بسنت، بہار، باگیسری، پھر بہت کچھ دادرا، کھتریوں اور چرواہوں کی دھنیں جیسے چیتی، بناری ٹھمری، ان میں بھی اسے

خوب دخل ہوگیا تھا۔ محمد افضل کا بارہ ماسا وہ کھترائیوں کی دھن میں ایسا پڑھتی کہ
کلیجے سننے والوں کے پانی ہوجاتے۔''(۹)

ادھر امراؤ جان ادا کو بھی موسیقی اور گلوکاری میں مہارت حاصل ہے اور وہ اس فنِ لطیف کے اسرار و رموز سے بہ خوبی آگاہ ہے۔ وہ خود بتاتی ہے:

''میری طبیعت فنِ موسیقی کے لیے بہت ہی مناسب پائی گئی۔ آواز بھی پکے گانے کے لائق تھی۔ سرگم صاف ہونے کے بعد استاد جی نے استائی شروع کرا دی۔ استاد جی بہت اصول سے تعلیم دیتے تھے۔ ہر ایک راگ کا سر بیورہ زبانی یاد کرایا جاتا تھا اور وہی گلے سے نکلواتے تھے۔ مجال نہ تھی کوئی سُر کومل سے اَت کومل، سُدھ سے اَسدھ یا تیور سے تیور تر ہوجائے۔ اور میری بھی تجتیں کرنے کی عادت تھی۔''(۱۰)

امراؤ جان کا ذوقِ مطالعہ عمدہ اور معیاری درجے کا ہے اور ''ظہوری، نظیری کا کل انتخاب'' جیسی کئی کتب اس نے زمانہ طفولیت میں ازبر کرلی تھیں۔ عمر کی آخری منزل تک شوق کا یہ عالم قائم رہا۔ ماضی اور حال کے آئینہ دار دو اقتباسات ملاحظہ ہوں جن میں امراؤ جان کے اشتیاقِ علمی کا اظہار ہوتا ہے:

''مولوی صاحب نے بہت ہی شفقت سے مجھے پڑھایا تھا۔ الف بے ختم ہونے کے بعد کریما، مامقیما، محمود نامہ صرف رواں پڑھا کے آمد نامہ یاد کرا دیا۔ اس کے بعد گلستاں شروع کرا دی۔ دو سطریں پڑھاتے تھے۔ سبق حفظ کرایا جاتا تھا، خصوصاً اشعار۔ لفظ لفظ کے معنی، فقرے فقرے کی ترکیب نوک زبان تھی۔ لکھنے پڑھنے پر بھی محنت کی۔ املا درست کرایا گیا، خط لکھوائے گئے۔ گلستان کے بعد اور کتابیں فارسی کی پانی ہوگئی تھیں۔ سبق اس طرح ہوتا تھا جیسے آموختہ پڑھا جاتا ہے۔ عربی کی صرف نحو اور دو ایک رسالے منطق کے پڑھے۔ سات آٹھ برس مولوی صاحب کے پاس پڑھتی رہی۔''(۱۱)

''اس زمانے میں کتب بینی کا شوق بڑھا، کیونکہ سوائے اس کے اب کوئی اور شغل نہ رہا تھا۔

میں سچ کہتی ہوں کہ اگر یہ شوق نہ ہوتا تو اب تک میں زندہ نہ رہتی ۔ جوانی کے ماتم اور اگلے قدردانوں کے غم میں کب کا خاتمہ ہوگیا ہوتا ۔ کچھ دنوں تو میں قصے کہانیوں کی کتابوں سے دل بہلاتی رہی۔ ایک دن پرانی کتابیں دھوپ دینے کے لیے نکالیں ۔ ان میں وہ ''گلستان'' بھی نکلی جو مولوی صاحب سے پڑھی تھی ۔ ادھر ادھر سے ورق الٹ پلٹ کے پڑھنے لگی۔ پہلے مجھے اس کتاب سے نفرت سی ہوگئی تھی۔ ایک تو اس لیے کہ تعلیم کا ابتدائی زمانہ تھا۔ عبارت مشکل معلوم ہوتی تھی ۔ دوسرے تجربہ نہ تھا۔ اس لیے کچھ سمجھ میں نہیں آتی تھی ۔ اب جو پڑھا تو وہ دقتیں دور ہوچکی تھیں ۔ خوب ہی دل لگا کے میں نے سرے سے آخر تک کئی مرتبہ پڑھا۔ فقرہ فقرہ دل میں اترا جاتا تھا۔ اس کے بعد ایک صاحب سے ''اخلاق ناصری'' کی تعریف سن کے اس کے پڑھنے کا شوق ہوا۔ انہی سے ایک نسخہ منگا کے پڑھا۔ واقعی اس کتاب کے مطالب بھی مشکل ہیں اور عربی لفظیں کثرت سے ہیں۔ اس لیے اس کے سمجھنے میں بہت دقت ہوئی مگر تھوڑا تھوڑا پڑھ کے بہت دنوں میں کتاب کو ختم کیا۔ پھر ''دانش نامۂ غیاث منصور'' نول کشور کے مطبع میں چھپا، اسے پڑھا۔ پھر ایک مرتبہ صغریٰ وکبریٰ کو بجائے خود مطالعہ کیا اور جو جو سمجھ میں نہیں آیا اسے پوچھ لیا۔ ان کتابوں کے پڑھنے سے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے دنیا کے بھید مجھ پر کھلتے جاتے ہیں ۔ ہر بات کی سمجھ آ گئی ۔ اس کے بعد میں نے بہت سی کتابیں اس قسم کی اردو فارسی کی، بجائے خود پڑھیں ۔ اس سے طبیعت کو جلا ہوتی گئی ۔ قصائدِ انوری وخاقانی جستہ جستہ پڑھے مگر جھوٹی خوشامد کی باتوں میں اب میرا دل نہ لگتا تھا اس لیے ان کو بند کر کے الماری میں رکھ دیا۔ فی الحال کئی اخبار بھی میرے پاس آتے ہیں ۔ انہیں دیکھا کرتی ہوں۔ ان سے دنیا بھر کا حال معلوم ہوتا رہتا ہے۔'' (۱۲)

وزیر خانم بھی کتب بینی کی شوقین تھی اور ان کتابوں کی فہرست خاصی طویل ہے جو وزیر خانم کے زیرِ مطالعہ رہیں:

> ''گلستاں، بوستاں، غزلیاتِ سعدی، کلامِ حافظ شیرازی، غزلیاتِ خسرو، فیضی کی مثنویاں، محمد افضل سرخوش اور شاہ نورالعین واقف کے دیوان، مثنوی رومی، حضرت میرزا مظہر جانجاناں شہید کا دیوان اور بیاض موسوم بہ ''خریطۂ جواہر''

اس کے مطالعے میں رہتیں۔شعرائے ریختہ میں شاہ نصیر صاحب تو اس کے استاد ہی تھے، دہلی کے اکثر اساتذہ، خصوصاً میاں محمد تقی میر، میرزا سودا، شیخ جرأت اور میاں مصحفی کا بہت سا کلام اس کا خوب دیکھا ہوا تھا۔ نئے شعرا میں وہ میرزا نوشہ، میاں ذوق اور شیخ ناسخ کی مداح تھی۔" (۱۳)

امراؤ جان ادا نے جس تہذیب اور معاشرت میں پرورش پائی وہاں شعر وشباب اور طاؤس و رباب کو اولیت کا درجہ حاصل تھا۔ ذوقِ شعر سے اس تہذیب میں صرف 'راہِ سخن' نہیں بل کہ 'راہِ ہوس' بھی نکلتی تھی۔ امراؤ کا تخلص ادا تھا اور دراصل یہ بھی اس کی ایک رنگین اور دل فریب ادا تھی جس سے وہ ہوش وخرد شکار کرتی تھی۔لیکن امراؤ کے ذوقِ سخن کو محض ایک مصنوعی، اکتسابی یا پیشہ ورانہ صلاحیت کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بہر حال ایک شاعرہ تھی اور اس کے پردے میں چوں کہ رسوا بول رہے ہیں، اس لیے شعروں کا انتخاب اسے رسوا نہیں کرتا۔ وہ گفت گو میں شعر کے برمحل استعمال سے واقف ہے اور ایسے واقف کاروں پر زیادہ فریفتہ ہوتی ہے جو سخن فہم ہوتے ہیں مثلاً سلطان صاحب سے تو ہم ذوقی کے سبب اسے الفت ہو جاتی ہے۔(۱۴) امراؤ جان ادا کی سخن گوئی سے نہ صرف اس کے اپنے دل کا معاملہ کھلتا ہے بل کہ "اٹھارویں انیسویں صدی کی ہند اسلامی تہذیب" کا حال بھی ظاہر ہوتا ہے جو فکرِ دنیا میں سر کھپانے کے بجائے فکرِ سخن میں مست رہتی تھی۔

وزیر خانم اگر چہ اس دیار کی رہنے والی تو نہیں جہاں امراؤ جان نے زندگی بسر کی تھی لیکن اس نے حرف ونغمہ کی رنگین دنیا دیکھ رکھی تھی۔ "شعر گوئی اس کے لیے مردوں کی برابری کرنے کا مشغلہ اور دلبری ودلستانی کا ایک ڈھنگ تھی۔" (۱۵) سخن گوئی کی جانب اس نے زیادہ توجہ نہ کی لیکن اس کی سخن فہمی کا ایک عالم معترف تھا۔ امراؤ کی خوش ذوقی صرف اردو شاعری تک محدود تھی لیکن وزیر خانم اردو اور فارسی، دونوں زبانوں کے شعری سرمائے پر دست رس رکھتی ہے۔ اس کا حافظہ بھی کمال کا ہے۔صورتِ حال کی مناسبت سے اس کے ذہن یا زبان پر کوئی نہ کوئی شعر ضرور ہوتا ہے۔ ناول میں اس کے لبوں سے جن اردو اور فارسی شعرا کا کلام ادا ہوا ہے، ان میں مولانا جامی، طالب آملی، میرزا جلال اسیر، خسرو،

حافظ، فیضی، عرفی، میر تقی میر، مصحفی، غالب، مومن اور میر حسن وغیرہم شامل ہیں۔ اس سے وزیر خانم کی طبیعت کی روانی اور ذوق کی فراوانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بات یہاں تک محدود نہیں رہتی، فاروقی صاحب نے ناول میں ایک محفل بھی سجائی ہے جس میں اسد اللہ غالب نے وزیر خانم کی موجودگی میں اپنا کلامِ بلاغت نظام پیش کیا تھا۔ (۱۶)

وزیر خانم کے مقابلے میں امراؤ جان ادا کے کردار میں عریانی اور ہوس ناکی کم ہے حال آں کہ اس کا 'پیشہ ورانہ کردار' اس بات کا متقضی تھا۔ امراؤ ایک تاریک دور کی حیات و معاشرت کے صرف نیم رخ کی آئینہ دار ہے۔ وزیر خانم اس تصویر کو مکمل کرتی ہے اور اس حقیقت کو عیاں کرتی ہے اس کمند ہوس کے اسیر معاشرے میں مناکحت کے علاوہ بھی تعلقات کی مختلف صورتیں رائج تھیں۔ ایسے ہی تعلقات کے نتیجے میں وزیر خانم کے ہاں داغ دہلوی جیسے شاعر کا تولد ہوا۔ امراؤ جان ادا البتہ بے اولاد ہی رہی۔ وزیر خانم کو امراؤ جان کا 'تکملہ' کہا جا سکتا ہے لیکن زیادہ قرینِ انصاف یہ ہے کہ وزیر خانم ایک مکمل، منفرد اور زندۂ جاوید کردار ہے جسے مصنف نے طبیعت کی جولانی، تخیل کی تابناکی اور 'لطیف ہوس ناکی' سے تخلیق کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے اور حواشی

(۱) سجاد ظہیر، سید، روشنائی، لاہور: مکتبہ اردو، ۱۹۷۶ء، ص ۳۵۳

(۲) محمد ہادی رسوا، امراؤ جان ادا، لاہور: مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۹۹ء، ص ۲۳۹

(۳) ڈاکٹر ممتاز احمد خان صاحب کا خیال ہے کہ ناول کا عنوان ''وزیر خانم کا عظیم المیہ'' ہونا چاہیے تھا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲ء، ص ۱۶

(۴) محمد ہادی رسوا، امراؤ جان ادا، ص ۱۴۸

(۵) ایضاً، ص۲۸۸ (۶) ایضاً، ص۸۹

(۷) ایضاً، ص۲۰۳، ۲۰۴

(۸) فاروقی، شمس الرحمٰن، کئی چاند تھے سرِ آسماں، کراچی، شہرزاد، ۲۰۰۶ء، ص۳۹، ۴۰

(۹) ایضاً، ص۱۲۵

(۱۰) محمد ہادی رسوا، امراؤ جان ادا، ص۶۶، ۶۷

(۱۱) ایضاً، ص۴۷ (۱۲) ایضاً، ص۲۹۹، ۳۰۰

(۱۳) فاروقی، شمس الرحمٰن، کئی چاند تھے سرِ آسمان، ص۱۹۷

(۱۴) محمد ہادی رسوا، امراؤ جان ادا، ص۱۰۵

(۱۵) فاروقی، شمس الرحمٰن، کئی چاند تھے سرِ آسماں، ص۱۲۶

(۱۶) ایضاً، ص۲۴۷ تا ۲۵۱